پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👉
https://www.facebook.com/groups
/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
📱0307-2128068
@Stranger ❤️❤️❤️❤️❤️❤️❤️

# فیض احمد فیض کی شاعری کا امتزاجی اسلوب

## ضیاالحسن

■ فیض احمد فیض کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ'' ان کی شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ بعض نقادوں نے اسے رومانیت سے گریز اور ترقی پسند حقیقت نگاری کی طرف سفر کا آغاز قرار دیا ہے، بعض دوسرے نقادوں نے اسے رومانوی حقیقت پسندی یا رومانویت اور ترقی پسندی کا امتزاج قرار دیا ہے۔ فتح محمد ملک نے اپنے مضمون ''فیض کی دو آوازیں'' مشمولہ ''تعصبات'' میں اسے فیض کے فطری رنگ شعر اور اختیاری حقیقت پسندی کی کشمکش بنا دیا ہے۔ وہ طنزیہ لہجے میں کہتے ہیں کہ فیض ترقی پسند حقیقت نگاری کی طرف صاحبزادہ محمود الظفر کے ہاتھ پر ''مشرف بہ اشتراکیت'' ہونے کے بعد راغب ہوئے ورنہ ان کی اصل شاعری رومانویت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے، جہاں ان کے شعری کمالات کھل کر اپنا اظہار کرتے ہیں۔ فیض جیسے اہم شاعر کے بارے میں ایسی متضاد آرا کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے کیونکہ جو شخص اپنے کسی کمال کے باعث لوگوں کی توجہ کا مستحق ٹھہرتا ہے، اس کے حوالے سے یہ اختلاف رائے ضرور سامنے آتا ہے۔ سلیم احمد نے ''نئی نظم اور پورا آدمی'' میں اس نظم کے بارے میں تضحیکی انداز اپنایا ہے۔ لکھتے ہیں:

''فیض اپنی اس نظم میں محبوبہ کو یہ مژدہ سناتا ہے کہ وہ دردمندوں اور غریبوں کی حمایت کے کام میں بہت معروف ہے، اس لیے اُس سے پہلی سی محبت نہیں کر سکتا اور آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ فیصلہ اس نے کسی شدید جذباتی کرب کے عالم میں سنایا ہے بلکہ اس طرح جیسے کوئی کسی کو ملازمت میں تبادلے کی خبر سناتا ہے اور خاص طور پر اس وقت جب تبادلہ ترقی کے ساتھ ہوا ہو۔''

طنزیہ اور تضحیکی انداز کے باوجود سلیم احمد کی رائے سے دو نتائج بہ آسانی اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ فیض نے شاعری میں ''دردمندوں اور غریبوں کی حمایت کے کام'' کا آغاز کر دیا ہے۔ گویا وہ بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ اس نظم میں ترقی پسند حقیقت نگاری کا اظہار ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ تبادلہ ترقی پر ہوا ہے یعنی اس نظم میں فیض کی تخلیقی شخصیت ارتقا پذیر نظر آتی ہے۔ ادب کی تفہیم و تجزیہ کا کام ہر نقاد اپنے نظریہ زندگی اور نظریہ ادب کے حوالے سے کرتا ہے۔ اس نظم کے حوالے سے ایک بات سب ہی نقادوں نے کہی ہے کہ یہ نظم فیض کی شاعری میں نئی حقیقت نگاری کے آغاز کا اعلان ہے۔ اس نئی حقیقت نگاری کا آغاز 1936 میں ترقی پسند ذہن رکھنے والے ادیبوں نے

سوچ سمجھ کر ایک باقاعدہ منشور کے تحت کیا کہ ادب کا منصب زندگی کی تلخ حقیقتوں کا ادراک و تجزیہ اور ایک روشن مستقبل کے لیے تحرک پیدا کرنا ہے۔ یہی شعور اس نظم میں بھی نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد خاں نے اس امتزاجی اسلوب کو اردو شاعری میں ایک نئے طرزِ ادا کی دریافت قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

”یہ نظم واقعی ایک نئے احساس کی ترجمان ہے۔ اس میں ایک نیا زاویہ نظر ہے، جس کی مثال اردو کی جدید شاعری میں کہیں اور نہیں ملتی۔“ [فیض احمد فیض۔ شاعر اور شخص]

ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے مضمون ”نئے شاعر۔ فیض“ میں لکھتے ہیں: ”فیض نے حسن و انقلاب کو ایک دوسرے میں ایسا سمو دیا ہے کہ انقلاب میں حسن اور حسن میں انقلاب کا پہلو نظر آنے لگا ہے اور یہ تحلیل اردو شاعری میں بالکل نئی ہے۔“

فیض کے امتزاجی اسلوب کی حامل دیگر نظمیں پڑھ کر ڈاکٹر آفتاب احمد اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی آرا اور بھی صائب معلوم ہوتی ہیں کیونکہ اس اسلوب کی حامل ہر نظم میں انھوں نے اس نئے اسلوب کو طرح طرح سے استعمال کیا ہے۔ ان کی نظم ”رقیب سے“ بھی اسی اسلوب کی حامل ہے۔ فیض کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس ایک اسلوب کو متنوع طریقوں سے برتا ہے اور کہیں بھی تکرار کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ”رقیب سے“ میں اردو غزل کی روایتی ٹرائیکا یعنی محبوب، عاشق اور رقیب تینوں ہی کردار ہیں لیکن تینوں ہی اپنی روایتی معنویت میں اضافہ کرتے ہوئے ترقی پسند حقیقت نگاری اور طبقاتی شعور کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ فیض نے ان کے درمیان ایک نئے تعلق کو دریافت کیا ہے۔ رقیب اب دشمن اور روسیاہ نہیں ہے بلکہ عاشق کے ساتھ احساسِ محبت میں شریک ہے۔ یہاں حسن بھی محض احساسِ جمال پیدا نہیں کر رہا بلکہ زندگی کے حقیقت پسند ادراک کے لیے محرک کام بھی دے رہا ہے۔ نظم کا آخری حصہ طبقاتی شعور اور مجبور طبقوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف ایک احتجاجی انداز لیے ہوئے ہے۔ یہ نظم پہلی نظم کی توسیع معلوم ہوتی ہے، پہلی نظم میں شاعر کہتا ہے کہ وہ معاشرے میں ہونے والی سماجی و معاشی ناانصافی کی وجہ سے احساسِ جمال اور عشق کے جذبات سے بے گانہ ہو گیا ہے۔ اس نظم میں حسن خود ایک محرک ہے اور احساس دردمندی پیدا کر رہا ہے۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ ناقدینِ شعر نے ترقی پسند شاعری پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا کہ یہ محض نعروں اور دعووں کا صحافتی اظہار ہے اور شاعرانہ اسلوب اور تخلیقی عناصر سے بے بہرہ ہے لیکن جب فیض نظم کی بنت کے لیے نئے احساسِ شعر سے کام لیتے ہیں اور جمالیاتی حسن کے ساتھ ایک دھیمے دھیمے سلگتے انداز میں ترقی پسند فکر کے بلند بانگ اور طوفانی موضوعات کا اظہار کرتے ہیں تو یہی نقاد اس کے خلاف بھی دلائل کا انبار لگا دیتے ہیں۔ سجاد حارث نے اپنی کتاب ”ادب اور ریڈیکل جدیدیت“ میں اس موضوع کے حوالے سے اپنے مضمون میں اس نقطۂ نظر کے خلاف ایک وضاحتی انداز اختیار کیا ہے۔ طرفہ تم یہ کہ غیر ترقی پسند نقادوں نے تو اس کے خلاف لکھا، ترقی پسندوں نے بھی فیض کے اس جمالیاتی اسلوب کو رد کر دیا۔ بعضوں نے تو یہ تک کہہ دیا کہ فیض چونکہ طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے ان کی شاعری میں ترقی پسندی کا اظہار کھل کر نہیں ہوا۔ ان کے

اعتراضات کا مرکزی نقطہ یہی ہے کہ فیض نے زندگی کی کرخت حقیقتوں کو کرخت شکل میں پیش کرنے کے بجائے ریشمی پردوں میں لپیٹ دیا ہے اور زندگی کی کرختگی اور کھردرے پن کو نمایاں نہیں ہونے دیا۔ اب کیا کیا جائے کہ فیض ترقی پسندی اور نئی حقیقت نگاری سے ذہنی مطابقت رکھنے کے باوجود ایک جمالیاتی احساس رکھنے والے شاعر تھے۔ انھوں نے اس حقیقت نگاری کا اظہار بھی اپنے مخصوص مزاج اور تخلیقی شخصیت کے حوالے سے کیا ہے۔ اگرچہ ان کی شاعری کا لہجہ دھیما پن لیے ہوئے ہے لیکن وہ اسی دھیمے دھیمے انداز سے قاری کے جذبات میں اتھل پتھل پیدا کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ترقی پسند شاعری کچھ ان ہی کی ذات سے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ اس فکر کو انھوں نے جس تخلیقی توانائی سے پیش کیا ہے، کم ہی کسی ترقی پسند شاعر کو نصیب ہوا ہے۔ عوامی سطح پر بھی بلیغ استعاروں کے باوجود ان کی شاعری کو پذیرائی ملی۔ وہ نہ صرف اعلیٰ تربیت یافتہ ذوق شعر کے حامل قاری کو متاثر کرتے ہیں بلکہ عام قاری بھی ان سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میر صاحب کے اس شعر کی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

اس بات کو خلیل الرحمن اعظمی شاعر کی تخلیقی شخصیت اور سماجی شعور کی اکائی قرار دیتے ہیں لکھتے ہیں:

"یہ شعور زندگی کے حقائق تک رسائی حاصل کر لینے یا سیاسی و سماجی مسائل کو اہم سمجھ لینے پر ہی منحصر نہیں... انھوں نے (فیض) نے اپنی شخصیت کے تمام عناصر میں ایک مرکزیت بھی پیدا کی ہے۔" [اردو میں ترقی پسند تحریک۔ ص:138]

"چند روز اور مری جان" جو پہلے "تسلی" کے عنوان سے شائع ہوئی، اسی امتزاجی اسلوب کی نظموں میں رجائی انداز نظر کی وجہ سے منفرد ہے۔ یہاں پہلی دفعہ شاعر ایک روشن مستقبل کی نوید سناتا ہے لیکن اس سلسلے کی نظموں میں "موضوع سخن" اور "دو عشق" اس فکر اور اسلوب کی شاہکار نظمیں ہیں۔ یہاں فیض نے رومان اور انقلاب عشق اور زندگی کے اس تضاد کو حل کر دیا ہے جو ان کی پہلی نظموں میں نظر آتا ہے اور جن پر اعتراضات کا ایک انبار ناقدین ادب نے لگا دیا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر آفتاب احمد اور جابر علی سید نے موضوع سخن کے دونوں حصوں کے آخری شعروں کو اردو کے رومانوی شاعروں پر طنز قرار دیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ شعر فیض کے مجموعی نظریۂ شعر سے ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں۔ دو عشق اس حوالے سے زیادہ مکمل، جامع اور فکری وضاحت کی حامل ہے۔ فیض نے اس نظم میں ہچکچاہٹ کے بغیر زندگی کے جمالی اور جلالی دونوں پہلوؤں کا نہ صرف ادراک کیا ہے بلکہ انھیں زندگی کے لیے ناگزیر قرار دیا ہے۔ اس نظم میں وہ اپنے تمام معترضین سے بے پروا نظر آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ انھوں نے ان نکتہ چینوں کی کج فہمی کو جان لیا ہے اور ان سے بے پروا ہو کر اپنی تخلیقی دنیا میں محو ہو گئے ہیں۔ رومانیت سے انقلاب اور پھر انقلاب کے جمالیاتی شعور تک فیض کے اس سفر کو پروفیسر قمر رئیس اپنے مضمون "فیض کی غزل کا اسلوب و آہنگ" میں یوں بیان کرتے ہیں:

"نقش فریادی کی شاعری میں بھی فیض تنہائی اور نسوانی حسن کی پرستش کے اسی دور سے گزرے ہیں لیکن

جلد ہی انھیں محسوس ہوا کہ اصل زندگی ایک کڑا درد ہے جو گیت میں ڈھلنے سے انکار کرتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب فیض کے سماجی شعور و آگہی نے انھیں دکھی، مظلوم اور کراہتی ہوئی انسانیت سے ہمیشہ کے لیے جوڑ دیا اور اب ان کی شاعری میں فطرت کی جگہ دبے کچلے محکوم انسانوں اور ان کی بے خوابی کے خوابوں نے لے لی۔ اس طرح ان کی رومانی حسیت انقلابی احساس و فکر کے سانچے میں ڈھل گئی۔"

"دست صبا" اور "زندان نامہ" کی بیشتر نظمیں ان کے اس دور کی یادگار ہیں جو انھوں نے راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں قید میں گزارا۔ ان مجموعوں میں فیض کی آواز انقلابی توانائی سے معمور ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قید نے ان کے انقلابی احساس کو مہمیز کر دیا ہو۔ وہ غالب کے اس شعر کی تصویر نظر آتے ہیں۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے/ رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

فیض نے "دست صبا" کے دیباچے میں لکھا تھا:

"شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے، گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے، اسے دوسروں کو دکھانا اسکی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر — اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جد و جہد چاہتے ہیں۔

فیض نے اپنی شاعری اور زندگی میں یہ تینوں کام عملی طور پر کر دکھائے۔ فوج کی ملازمت کے دوران میں فاشسٹ قوتوں کے خلاف جنگ میں اپنا کردار ادا کیا۔ صحافت کے حوالے سے قلم کی لڑائی، پنڈی سازش کیس کے حوالے سے قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں اور لوٹس (Lotus) کے حوالے سے بین الاقوامی امن و سلامتی کے لیے عملی جد و جہد کی۔ ان کی زندگی کی ان سرگرمیوں کا عکس ان کی شاعری پر براہ راست دیکھا جا سکتا ہے۔ قید کے دنوں کی شاعری میں ایک باغیانہ طمطراق اور ایک انقلابی شان نظر آتی ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ ظاہری مصائب نے ان میں زندگی کی حرارت کو دو چند کر دیا ہے۔ یہ حوصلہ مندی ایک سچے انسان اور کھرے انقلابی میں ہی ہو سکتی ہے وگرنہ ہمارے ہاں تو سختی پریشانی اور پشیمانی کا شکار کر دیتی ہے۔

فیض صاحب کے شعری اسلوب اور فکر میں وقت کے ساتھ ساتھ گہرائی اور پختگی ایک ارتقائی صورت میں نظر آتے ہیں۔ انکی غزلیں، قطعات اور چھوٹی بڑی بے شمار نظمیں اس پختگی کا مظہر ہیں۔ یہاں ہم ان کی چند شاہکار نظموں کے حوالے سے بات کریں گے جن کی ستائش ہر نقاد نے بقدر حوصلہ و ظرف کی ہے۔ یہاں یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ "دو عشق" میں ان کے ہاں جو دو ٹوک رویہ نظر آتا ہے، بعد کی شاعری میں ان کی فکر اور بھی زیادہ واضح ہو کر سامنے آئی ہے۔ ان کی نظم "ملاقات" کو ہر نقاد نے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ نظم اپنی بنت، امیجری اور جدید حسیت کے حوالے سے اردو کی شاہکار نظموں میں شمار ہو سکتی ہے۔ یہاں انھوں نے انقلاب کو Myth بنا دیا ہے۔ نظم کے پہلے حصے میں وہ رات کی عظمت بے کرانی اور سحر کا ذکر کرتے ہیں لیکن وہ اس سحر کے اسیر نہیں ہوتے بلکہ اس کو ختم کرنے کا اسم دریافت کرتے ہیں۔

ہر ایک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے

جگر سے نوچے ہیں اور ہر ایک کا ہم نے تیشہ بنالیا ہے

سجاد ظہیر نے ان چار مصرعوں کو فیض کا اپنے خاص رنگ شعر سے گریز قرار دیا ہے۔ یہ مصرعے نہ صرف نظم کی موضوعاتی بنت میں گریز کا کام دے رہے ہیں بلکہ فیض کے شعری تجربے میں بھی ایک اضافہ ہیں۔ فیض کی یہ نظم مایوسیوں میں امید کی کرن ہے۔ در نا امیدی بند کرتی ہے اور ایک نئے جہاں کی طرف — ایک روشن مستقبل کی طرف در وا کرتی ہے۔ یہ نظم بجھے ہوئے دلوں میں زندگی کی حرارت پیدا کرتی ہے۔ زندگی میں آنے والی رکاوٹوں، مصیبتوں، بلاؤں اور آلام کو ایک نئی صبح کا مژدہ قرار دیتی ہے۔

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے/ یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقین جو غم سے کریم تر ہے/ سحر جو شب سے عظیم تر ہے

عظیم رات سے عظیم تر صبح کا خواب ہی فیض کی شاعری کا بنیادی نقطہ ہے۔ اسی نظم کے بارے میں سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

"فیض کی نظم ملاقات مجھے پسند آئی ہے۔ اس میں علائم کی مرصع نگاری اپنے کمال کو پہنچ گئی ہے اور پہلے مصرعے سے شروع ہو کر [یہ رات اس درد شجر ہے] نظم کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں کے جیسے نازک پھول چاروں طرف کھلتے چلے گئے ہیں۔"

اس نظم میں جوانی کی جذباتیت اور ابتدائی انقلابی تندی کے بجائے ایک وقار اور تخلیقی رچاؤ نظر آتا ہے۔ اپنے آدرش پر یقین محکم کا ایک ایسا احساس ملتا ہے جو زندگی پر ایمان اور نظریے سے وابستگی کو مضبوط کرتا ہے۔ اب کوئی ابہام باقی نہیں رہا — کوئی بے یقینی یا نا امیدی باقی نہیں رہی۔ اس نظم کا لہجہ بھی اپنے اندر وہ تمکنت لیے ہوئے ہے جو اعلیٰ فن کا خاصا ہے۔ ملاقات کے علاوہ بھی فیض صاحب کی اور نظموں مثلاً ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے [زندان نامہ]، شام [دست تہ سنگ] یہاں سے شہر کو دیکھو [سر وادیٔ سینا] اور یہ ماتم وقت کی گھڑی ہے [میرے دل میں مسافر] میں ان کی فن کاری کا یہی انداز ملتا ہے۔

رومانویت سے حقیقت نگاری اور حقیقت نگاری کے مختلف زاویوں کے انکشاف کو جس طرح فیض احمد فیض نے تخلیقی رچاؤ سے پیش کیا ہے، ان کے عہد کے کم ہی شاعروں کو نصیب ہوا ہے، خاص طور پر ترقی پسند حقیقت نگاری کا جیسا تخلیقی اظہار ان کی شاعری میں ہوا ہے، دوسرے ترقی پسند شاعروں کے حصے میں نہیں آیا اس لیے نظریاتی تحرک کے حوالے سے ہم فیض کو عظیم ترقی پسند شاعر کہہ سکتے ہیں۔ اس بات کا برملا اعتراف معتدل اور متوازن فکر رکھنے والے تمام نقادوں نے کیا ہے۔ ان کے فکر و فن کے ارتقائی مراحل کو حرف آخر سمجھ کر حتمی لہجے میں ان کی شاعری کو رد کرنے والے نقادوں نے کسی بھی طرح ادب کی تفہیم کا فریضہ سرانجام نہیں دیا شاعروں کو اُن کے ارتقا کے کسی ایک مرحلے میں نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کی تفہیم اس کی شاعری کے کلی مطالعہ سے ہی ممکن ہے ورنہ اقبال ہوں، راشد ہوں یا فیض اپنی ابتدائی تخلیقات میں اس درجے کا شاعر نظر نہیں آتے جو ان کے فن کے کلی جائزے کے بعد متعین ہوتا ہے۔ ■

ZEHNE JADID
C-2, AB Complex,
179/8, Zakir Nagar,
New Delhi - 110025 INDIA
Ph. 0091-11-26983804
E-mail:zehnejadid@gmail.com
www.zubairrazvi.in
Editor: Jamshed Jahan

September to November 2011
ISSUE 61 Vol XXII
Four Issues: Rs. 200/-25$ US
Library Edition:Rs.240/-
(For Four Issues- Hard Bound)

مدیر • جمشید جہاں

جلد:۲۲ شمارہ:۶۱

ستمبر تا نومبر ۲۰۱۱ء

• قیمت

فی پرچہ • ۵۰/روپے

چار شمارے • ۲۰۰/روپے

لائبریریوں سے • ۲۴۰/روپے

(مجلد چار شمارے)

• بیرونی ممالک سے

فی پرچہ • چھ ڈالر امریکی

چار شمارے • پچیس ڈالر امریکی

تزئین: ذہنِ جدید

• قانونی مشیر: سیّد کامران رضوی ایڈوکیٹ

• 'ذہنِ جدید' کے لیے بیرونِ ہند ترسیل زر اور رابطے:

• Dr. Bedar Bakht
21-Whiteleaf cresecent
Scarborough, ONTARIO
Canada MIV 3G1
e-mail:bbakht@rogers.com

• Dr. Fareha Razvi
2224-U Street
UNL Family Housing
Linclon 68503 NE - U.S.A.
E-mail: rfareha@yahoo.com
R N 50779/90

• کسی بھی تنازعہ کی صورت میں قانونی کارروائی/ چارہ جوئی دلی ہی کی عدالت میں ہوگی

• ترسیل زر اور رجسٹرڈ ڈاک کے لیے پتہ:

C-2, AB Complex, 179/8, Zakir Nagar, New Delhi- 110025

• سادہ ڈاک کے لیے: پوسٹ بکس 9789، نیو فرینڈس کالونی نئی دہلی–۲۵

---

مطبع : JK آفسٹ پرنٹرس، دلی-6

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر جمشید جہاں نے 179/8, Zakir Nagar, New Delhi- 110025 سے شائع کیا۔